Vol. 5 No.4 2021

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

پاکستانی ریڈیائی (مطبوعہ) ڈراموں میں مشرقی و مغربی تہذیب کی آویزش

شگفتہ خورشید

پی ایچ۔ڈی سکالر

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Abstract

This paper deals with the confliction of Eastern and Western Civilization in Pakistani Radio (published) dramas. the subcontinent has been under the influence of western civilization for centuries. the civilization bbought by the British mentally enslaved the people of this region that its effects are still visible today.

When Pakistan came into being, it had its own culture and civilization but our young generation could not escape the influence of western civilization. our playwriths, whether they are stage writers or radio writers, they felt it strongly. they also introduced eastern and western civilization in their radio dramas and made them part of their dramas where there is an atmosphere of conflict between the two civilizations. It is seen in more religious aspects, women's freedom, dress, life style and the arts.Our playwrights have highlighted the conflictiong aspects of these two civilizations along with social issues, so that our young generation can take pride in recognizing and adopt in this civilization.

Keywords: *Subcontinent, Western Civilization, Eastern Civilization, Pakistani Culture and Civilization, Radio Playwright, Young Generation, Confliction, Freedom, Religious Aspects, Social Issues.*

ملخص

برصغیر کا خطہ صدیوں مغربی تہذیب کے زیرِ اثر رہا ہے۔ انگریزوں کی لائی ہوئی تہذیب نے اس خطے کے لوگوں کو ذہنی طور پر اپنا ایسا غلام بنایا کہ اس کے اثرات آج بھی نظر آتے ہیں۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اس کی اپنی ثقافت و تہذیب تھی لیکن ہماری نوجوان نسل مغربی تہذیب کے اثر سے باہر نہ نکل سکی۔ ہمارے ڈراما نگار خواہ وہ اسٹیج کے لکھنے والے ہوں یا ریڈیو کے انھوں نے اس بات کو شدّت سے محسوس کیا۔ انھوں نے اپنے ریڈیائی ڈراموں میں مشرقی و مغربی تہذیب کی پہچان بھی کروائی اور جہاں ان دونوں تہذیبوں میں تصادم کی فضا نظر آتی ہے اسے بھی اپنے ڈراموں کا حصہ بنایا۔

یہ آویزش زیادہ تر مذہبی پہلوؤں، عورت کی آزادی، لباس، رہن سہن اور فنونِ لطیفہ میں نظر آتی ہے۔ ہمارے ڈراما نگاروں کے معاشرتی مسائل کے ساتھ ان دونوں تہذیبوں کے متصادم پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا ہے تاکہ ہماری نوجوان نسل اپنی تہذیب کو پہچانے اور اس کو اپنانے میں فخر محسوس کرے۔

کلیدی الفاظ: برصغیر، مغربی تہذیب، مشرقی تہذیب، اثرات، پاکستانی تہذیب و ثقافت، ریڈیائی ڈراما نگار، نوجوان نسل، تصادم، عورت کی آزادی، مذہبی پہلو، معاشرتی مسائل۔

اصنافِ ادب میں 'ڈراما' کو خاص اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ ابتدا میں اسٹیج ڈرامے نے رواج پکڑا۔ اس دور کے اپنے تقاضے تھے۔ جس کے مطابق ڈراما نگاروں نے ڈرامے تحریر کر کے تماشائیوں کے سامنے پیش کر کے داد وصول کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ نشری ڈراموں کی روایت کا آغاز بھی برصغیر میں ہی ہو چلا تھا۔ ریڈیو خبروں کے علاوہ ڈراموں اور کہانیوں کے سننے کا عرصہ تقریباً ثلث صدی پر محیط ہے۔ پوری دنیا میں اس روایت کو دنیا کے مختلف اسٹیشنوں نے آگے بڑھایا۔

برصغیر میں آل انڈیا ریڈیو نشریات کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا۔ اس پر مختلف زبانوں میں کہانیوں کو سننے کا رواج دیا گیا۔ ابتدا میں افسانے اور ناول بھی سنائے جاتے تھے۔ مثلاً ہادی رسوّا کا 'امراؤ جان ادا'، پریم چند کا ناول 'گئودان' اور رتن ناتھ سرشار کا ناول 'فسانۂ آزاد' بالاقساط نشر ہوتے رہے۔ اردو ریڈیائی نشریات کو کامیاب بنانے میں نامور افسانہ نگار اور مصنفین نے اہم کردار ادا کیا۔

اس دور میں بعض مصنفین نے ریڈیو سے مستقل وابستگی اختیار کی۔ ان لوگوں نے کہانیاں اور ڈرامے تحریر کیے۔ ان میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور رابندر ناتھ اشک شامل تھے۔ اس دور میں ڈرامے باقاعدگی سے نشر ہونے لگے۔ ریڈیائی ڈراموں کی مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہو تا گیا۔ اس ابتدائی

Vol. 5 No.4 2021

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

دور میں اردو ڈراما لکھنے والوں میں حکیم احمد شجاع، سید عابد علی عابد، فضل الحق کے نام اہم ہیں۔ اس دور میں تراجم اور طبع زاد دونوں قسم کے ڈرامے نشر ہوتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو ڈراما نگاروں کی خاصی تعداد ہو چکی تھی جنھوں نے باضابطہ ریڈیائی ڈرامے تحریر کیے۔ پہلا ریڈیو اسٹیشن برصغیر میں دہلی میں قائم ہوا تھا۔

سعادت حسن منٹو نے ریڈیائی ڈرامے بہت لکھے۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعوں میں 'آؤ'، 'تین عورتیں'، 'کروٹ'، اور 'نیلی رگیں' قابل ذکر ہیں۔ اس ابتدائی مشترکہ آل انڈیا ریڈیو کے لیے کرشن چندر نے بھی ڈرامے تحریر کیے۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'دروازہ' جو چھ ڈراموں پر مشتمل ہے قابل ذکر ہے۔ رجندر سنگھ بیدی کا پہلا مجموعہ 'بے جان چیزیں'، دوسرا مجموعہ 'سات کھیل'، ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ عصمت چغتائی نے جو ڈرامے تحریر کیے ان کا مجموعہ 'شیطان' عنوان کے تحت شائع ہوا۔ میرزا ادیب نے یک بابی ڈرامے تحریر کیے جو ریڈیو سے نشر ہوئے۔ ان کے ڈرامائی مجموعوں میں 'لہو اور قالین'، 'آنسو اور ستارے' اور 'ستون' مقبول ہوئے۔

ریڈیائی اردو ڈراما کے ابتدائی دور میں دوسری زبانوں کے تراجم کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ فرانسیسی، روسی اور بنگالی زبانوں کے ڈراموں کے ترجمے کر کے ریڈیو پر نشر کیے جاتے تھے۔ حکیم احمد شجاع نے بھی تراجم کیے۔ اس کے علاوہ نور الہٰی و محمد عمر، امتیاز علی تاج اور سید انصار ناصری شامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ پاکستان ریڈیو کی نشریات پاکستان کی پہچان بنی، ہندوستان کی الگ ریڈیائی نشریات چلیں۔ اب پاکستان اور ہندوستان میں ریڈیائی ڈراما کی تاریخ متوازی گرم سفر رہی۔

آل انڈیا ریڈیو پر بھی نشری ڈرامے کی ایک مضبوط روایت قائم ہو چکی تھی۔ پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہی پاکستانی ریڈیائی ڈرامے نے اسٹیج ڈرامے کی مٹتی روایت کو نشری ڈرامے کی صورت میں زندہ کیا۔ قدیم ڈراما نگاروں نے اپنا مقام نشری ڈراما میں بنا لیا تھا۔ تقسیم کے بعد ان کے ساتھ نئے ڈراما نگاروں کی کھیپ تیار ہو گئی اور اس قافلے کے ساتھ کچھ نئے ڈراما نگار شامل ہو گئے تھے۔ پاکستان میں ہاجرہ مسرور، انتظار حسین، بانو قدسیہ، عشرت رحمانی، شوکت تھانوی اور جاوید اقبال کے نام بہت اہم ہیں۔ یہ ابتدائی پاکستانی ریڈیائی ڈرامے تحریر کرنے والے ادیب ہیں۔

پاکستان ریڈیو نے نشری ڈراما میں ایک مستحکم روایت قائم کی جسے ڈرامے کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ہفتے میں ایک شام کوئی نہ کوئی ڈراما نشر ضرور ہوتا تھا۔ اب تک بہت سے ڈرامے نشر ہو چکے ہیں۔ مختلف پاکستانی ریڈیو اسٹیشنوں سے ڈرامے مکرر ہوتے تھے۔

ریڈیو نشریات اور نشری ڈراما کے لیے صوتی اثرات کی اہمیت مسلم ہے۔ ڈرامے کی تاثیر بڑھانے کے لیے موسیقی سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ اس کا زیر و بم ڈرامے کے واقعے کے تاثر کو مزید زائد کر دیتے تھے۔ ریڈیو ڈراما اسٹیج اور ٹیلی ویژن کی نسبت صرف آواز کی مدد سے ہی کردار اپنا رول اور واقعات واضح کرتے تھے۔ پاکستان ریڈیائی ڈرامے کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ابتدا ہی سے اچھے صداکار ملتے گئے۔ رشید امجد لکھتے ہیں:

> "نشری ڈرامے کو اعلیٰ درجے کے صداکار بھی ملتے چلے گئے۔۔ یہاں ایک نام کا ذکر بہت ضروری ہے اور یہ نام ہے الطاف الرحمن کا۔ لاہور ریڈیو سے سینکڑوں ڈرامے نشر ہوئے ہیں اور ہر ڈرامے میں صوتی اثرات الطاف الرحمن ہی نے دیے ہیں۔"[1]

پاکستانی ریڈیائی ڈراموں کا معیار اسٹیج ڈراموں سے بلند رہا ہے۔ اگرچہ ٹی وی کے آغاز سے یہ ڈراما متاثر ہوا لیکن ریڈیو ڈرامے نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے بعض سلسلے کافی مقبول ہوئے ان میں شوکت تھانوی کا 'قاضی جی' جس کو پروڈیوس بھی انھوں نے خود کیا اور مرکزی کردار بھی خود ادا کرتے تھے۔ 'حامد کے گھر' انتظار حسین نے کراچی ریڈیو سے سلسلہ شروع کیا جو مستقل نشر ہوتا رہا۔ 'تلقین شاہ' سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ اس کو اشفاق احمد نے تخلیق کیا۔

پاکستان ریڈیو ڈراما نے ڈرامے کو دوبارہ زندگی دی۔ اس وقت یہ اس صنف کا سہارا بنا جب یہ زوال کی آخری سیڑھی پر تھا۔ ریڈیو ڈراما نے اپنے سامعین کو صحت مند تفریح فراہم کی۔ پاکستان ریڈیو ایک ورکشاپ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس دور کے ڈراما نگاروں اور اداکاروں کے لیے جنھوں نے پاکستان ٹی وی کے لیے بھی اپنے کارنامے دکھائے۔ رشید امجد لکھتے ہیں:

> "ریڈیو پاکستان کا اس سے بڑا اور اہم کردار یہ ہے کہ یہ ادارہ ڈراما نگاروں، پروڈیوسروں اور اداکاروں کے لیے ایک قسم کی ورکشاپ بن گیا تھا۔ آج ہم ٹیلی ویژن میں جتنے ڈراما نگار اور اداکار دیکھتے ہیں ان کی بیشتر تعداد ریڈیو کی تربیت گاہ ہی سے فیض پا کر بنی ہے۔ ریڈیو نے صرف ٹیلی ویژن ہی کو گوناں گوں ذہانتیں مہیا نہیں کیں فلم بھی اس سے فیض یاب ہوئی ہے۔"[2]

Vol. 5 No.4 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

قیام پاکستان کے بعد کم وبیش نصف صدی سے زیادہ ریڈیو نے مسلسل سفر جاری رکھا۔ آج بھی ریڈیو بہت اہمیت رکھتا ہے تاہم ڈرامے کی صنف نے پاکستان ٹیلی ویژن کو کامیاب بنایا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے پاس ایک بہت اہم ڈراموں کا ذخیرہ ہے۔ آج بھی ہمارے ملک کے وہ علاقے جہاں ٹی وی کی سہولت نہیں ہے ریڈیو پروگرام شوق سے سنے جاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان پر ہر سال ایک مرتبہ ہر اسٹیشن پر ڈرامافیسٹیول ہوتا ہے جو نئے اور پرانے ڈرامانگاروں کو سراہتا ہے اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ ریڈیو ڈراما تسلسل کے ساتھ جاری رہا اور آج بھی جاری ہے۔

تقسیم پاکستان کے بعد صورت حال بدلی تو تہذیب و تمدن، تاریخ اور معاشرہ بھی بدلا۔ برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو انگریزوں کی دی ہوئی تہذیب نے بھی متاثر کیا۔ نوزائیدہ مملکت کو ابتدا میں بہت سے محاذ پر لڑنا پڑا۔ مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ، لٹے ہوئے قافلوں کا دکھ، وہ نوجوان خواتین جنھیں اغوا کر لیا گیا تھا، انسان نے انسانیت کو بری طرح پامال کر دیا تھا۔ اس وقت کے بھیانک مناظر نے ہمارے ملک کے لکھنے والوں کے فکر وخیال میں ایک ہل چل مچا دی۔ ادیبوں اور مصنفین کے لکھنے کے موضوعات بدل گئے۔ عصمت چغتائی کا ڈراما 'دھانی بانکپن'، فرقہ وارانہ فسادات کا عکاس ہے۔ اسی طرح تقسیم پاکستان کے بعد عصمت کا ایک اور ڈراما 'انسانیت کی موت' بھی ہجرت کے وقت زہرہ لڑکی اپنی متاع عزیز سے محروم ہو گئی۔

حقیقت نگاری تحریک سے وابستہ ڈرامانگاروں نے جو ڈرامے تحریر کیے ان میں معاشرے کے تلخ حقائق کو پیش کیا۔ طبقاتی کشمکش ڈراموں کو موضوع بنایا۔ اس کے علاوہ علامت نگاری کا رجحان بھی اُبھرا جس کے تحت ڈراموں میں بھی علامت نگاری کو استعمال کیا گیا۔

وقت کے ساتھ ڈرامانگاروں نے نئی راہیں اور نئے موضوعات ڈراموں میں سموئے۔ ریڈیو ڈرامانگاروں نے طبقاتی کشمکش کے ساتھ جاگیردارانہ نظام اور مذہب اور آزاد خیال طبقات کو بھی موضوع بنایا۔ ان فرقوں اور ذہنی خیالات میں تصادم کی فضا قائم ہوئی۔ مزدور اور کسان طبقہ بھی تصادم کا شکار تھا۔ مذہب اور آزاد خیالی کی کشمکش اور آویزش تو برصغیر میں بہت عرصے سے چلی آرہی تھی اور یہ مغربی تہذیب کی یلغار سے ہی در آئی تھی۔ اس تصادم کے بادل کے سائے سے بچنا کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ تخلیق کار بھی اس کو موضوع بنائے بنا نہ رہ سکے۔ ہمارے مصنفین پر بھی یہ رجحانات اثر انداز ہوئے جس کے باعث ادبا اور تخلیق کار مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ کچھ نے ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا اور بعض نے ادب برائے زندگی کو اپنی بساط بنایا۔

حجاب امتیاز علی تاج نے افسانوں کے ساتھ کچھ ڈرامے بھی تحریر کیے۔ 'شکاری کی بیوی'، 'قطرہ فانی'، 'دوپہر' جیسے ریڈیائی ڈراموں میں طبع آزمائی کی۔ جب کوئی سانحہ ہوتا ہے اس کے اثرات بھی گردو پیش پر ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ادیبوں کے ذہنوں میں جنگ کی ہولناکیاں راسخ کیں تو تمام مسائل ہیچ نظر آنے لگے اور صرف جنگ کے اثرات ہی نظر آنے لگے۔

مشرق کی تہذیبی روایات کی شفافیت پر جب مغرب کی آلودہ کرنوں نے اپنا رنگ چڑھایا تو یہ دھندلا گئی جس سے اصل مشرقی شناخت بھی مشکل ہو گئی۔ اصناف ادب میں سے ڈراما بھی اس سے محفوظ نہ رہا جس کے باعث ڈرامے میں وہ باتیں شامل ہوتی گئیں جو مشرقی تہذیب سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ ابراہیم یوسف 'اردو کے اہم ڈرامانگار' میں لکھتے ہیں:

> ”مغرب اور مشرق کے اس ملاپ سے ایسا ناجائز بچہ جنم لیتا ہے جس کی کوئی شناخت ممکن نہیں تھی۔ پھر بھی اردو ڈرامے کی جھولی ان ناجائز بچوں سے بھرتی رہی۔ کہیں کہیں اس تاریکی میں روشنی کی کرنیں بھی نمودار ہوئیں اور وہ قابل ستائش ہیں۔“[3]

ہمارے ہاں ڈرامانگاروں نے جو ڈرامے تحریر کیے ان میں مشرقی و مغربی تہذیب کی آویزش کی نوعیت مذہبی ثقافتی، لسانی، سماجی اور اقتصادی ہے، جو آج تک پائی جاتی ہے۔ یہ کشمکش ذہنی بے چینی کا باعث بھی بنتی ہے۔ جدید اور قدیم کی آویزش واضح نظر آتی ہے۔ آزادیٔ نسواں کے بارے خیالات کا تصادم بھی ان ڈراموں کا حصہ بنا ہے۔ پردے کے مسائل یہ بنیادی امور ہیں جن میں آویزش نظر آتی ہے۔

پاکستان کے لوگوں نے عرصہ تک انگریزوں کے ساتھ زندگیاں بسر کیں۔ مغربی تہذیب کو اپنائے رکھا اگرچہ ہمارے لوگ دلی طور پر اس تہذیب کو پسند نہیں کرتے تھے تاہم اسے اپنائے بغیر چارہ نہ تھا اور اس کے تمام پہلو منفی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل نے اسے اپنایا اور اسے فیشن کے طور پر اختیار کیا۔ مشرقی اور مغربی تہذیب میں مشترک صفات اور مفادات بھی ہوتے ہیں ان کی اقدار میں اشتراک پایا جاتا ہے تاہم کچھ پہلو اور خصوصیات و اقدار ایسے ہیں جہاں دونوں تہذیبوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور کش مکش کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

Vol. 5 No.4 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

قیام پاکستان کے بعد بھی مغربی تہذیب نے ساتھ ہی سفر کیا۔ اس وقت سے اب تک مغربی تہذیب سے ذہنی طور پر چھٹکارا حاصل نہیں کر پائے۔ تاہم پاکستان کی اپنی تہذیب اور ثقافت ہے اور یہ مشرقی تہذیب ہے۔ اس پر مغربی تہذیب کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ہمارے ریڈیو ڈراما نگاروں نے بھی معاشرے کے حالات پر گہری نظر رکھی اور اپنے ڈراموں میں ان دونوں تہذیبوں کی کش مکش کو عیاں کیا ہے۔ ہماری نئی نسل نے اسے فیشن کا نام دیا ہے جس میں مغربی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔ بات چیت کا انداز، ملنے ملانے کے آداب، کھانے پینے کے طریقے، لباس اور رسومات تک میں یہ آویزش پائی جاتی ہے۔ ہمارے ڈراما نگار ان تمام پہلوؤں سے آگاہ ہیں جہاں یہ دونوں تہذیبیں ٹکرا کر کشیدگی پیدا کرتی ہیں۔

عورت کی آزادی جو مغربی تہذیب میں ہے وہ مشرقی عورت کے لیے عیب بن جاتی ہے۔ وہ لباس جو مغربی عورت کا پہناوا ہے وہ مشرقی عورت پہننا چاہے تو معیوب سمجھا جاتا ہے تاہم اسے ہمارے معاشرے میں جدیدیت اور فیشن کے نام پر اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تہذیب کو فرنگی تہذیب بھی کہا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد نئی تہذیب و تمدن کے اپنے تقاضے تھے۔ ساتھ ہی مغربی تہذیب جو ذہنوں میں راسخ ہو چکی تھی اس سے کما حقہ چھٹکارا بھی ممکن نہ تھا۔ ہمارے قدامت پسند طبقے نے مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ جس سے آویزش کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ ہمارے ڈراما نگاروں نے بھی اپنے ڈراموں میں اس آویزش کو بیان کیا ہے۔

سبق پھر پڑھ

نواز کاوش کا تحریر کردہ یہ ڈراما جس میں نوجوان طلبہ و طالبات ایک ادارے میں مخلوط تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دونوں میں دوستیاں ہیں۔ ہماری مشرقی تہذیب میں مخلوط تعلیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا جب کہ مغرب میں مخلوط تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ساتھ ہی قبائلی روایات جب مغربی تہذیب سے ٹکراتی ہیں تو مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

وجیہ اور ملیحہ ایک ہی ادارے میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وجیہ قابل لڑکا ہے۔ دوسرے لڑکے اور لڑکیاں ان سے حسد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ناکام کرنے اور کالج سے نکالنے کے لیے ثاقب اور شمسہ یوم آزادی کی تقریب میں ان کے ساتھ کھیل کھیلتے ہیں۔ خالی شراب کی بوتلیں وجیہ اور ملیحہ کے پاس رکھ کر ان کی چائے میں نشہ ملا کر پلا دیتے ہیں جس سے کالج کا سربراہ اور چند دوسرے اساتذہ وجیہ اور ملیحہ کو مارنے کا حکم دیتے ہیں۔ جب کہ ان کے والدین ان کے حق میں گواہی دیتے ہیں۔

مغربی تہذیب میں شراب پینا ایک عام فعل ہے جب کہ مشرقی تہذیب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ملیحہ اور وجیہ کی بات سنے بغیر یک طرفہ فیصلہ سنایا گیا ہے:

"ملیحہ: یہ یک طرفہ تصویر ہے۔ ہم قبائلی روایات کے پالے لوگ ہیں۔ ہم مشرقی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم اس طرح کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"[4]

اسی طرح مغربی تہذیب میں نشہ کرنا معیوب نہیں ہے اور نہ ہی لڑکے لڑکی کا آزادی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا۔ تاہم مشرق میں نشہ تو دور کی بات آزادانہ گفتگو کرنے کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ عادل منصف ہے وہ ان طلبا سے بے حد ناراض ہے اور انھیں سزا کا مستحق سمجھتا ہے۔

"عادل: اب غور سے سنو، یہ دونوں کالج میں رنگ رلیاں مناتے پکڑے گئے ہیں۔ پرنسپل نے انھیں اسی وجہ سے نکال دیا۔ جب انھیں نشے کی حالت میں دیکھا گیا تو شراب کی خالی بوتلیں ان کے پاس پڑی تھیں۔"[5]

اسی طرح ملیحہ اور وجیہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن وہ برملا اپنے بزرگوں سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ خاص کر ملیحہ جو ایک لڑکی ہے۔ وجیہ ملیحہ کو شادی کے لیے ہاں کرنے کو کہتا ہے تو وہ کہتی ہے:

"ملیحہ: میں نے کہا ناں۔۔۔ میں ڈرتی ہوں، میں روایتی لڑکی ہوں۔ میں تاب نہیں لا سکتی معاشرتی کٹھن کا۔

وجیہ: لیکن تم نے تو وعدہ کیا تھا ساتھ نبھانے کا۔

ملیحہ: میرے رگ و ریشے میں تمھاری چاہت سانس لیتی ہے۔ میرے اندر ایک ایسا موسم ہے جس کے سارے جھرنے تمھارے ساتھ جڑے ہیں۔ میری ایک ایک سانس امانت ہے۔ مگر میں نے کہا ناں میں مشرقی بیٹی ہوں۔ والدین اور سوسائٹی سے بغاوت نہیں کر سکتی۔ اگر انھوں نے ہمارے راستے میں بند نہ باندھے تو میں دل و جان سے تمھاری ہوں۔"[6]

Vol. 5 No.4 2021

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

اس موڑ پر مشرقی اور مغربی تہذیب کی آویزش کے باعث دو پیار کرنے والے دل بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایک نیا موڑ

نواز کاوش نے اپنے اس ڈرامے میں نئی تہذیب کی چکا چوند سے متاثر ہونے والے اور سادہ اور متوسط طبقے کی سوچ اور خیالات واضح کیے ہیں۔ بینا اور سلیم بچپن کے منگیتر ہیں۔ سلیم ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ماں کپڑے سیتی ہے اور گھر کے اخراجات میں مدد کرتی ہے۔ بینا کی سوچ اور اس کے گھر والوں کی سوچ ایڈوانس ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کو دقیانوسیت کا نام دیتے ہیں:

"بینا: سیٹلائٹ اور گلوبل ولیج میں رہتے ہوئے وہی دقیانوسی روایات، رسمیں، ماضی کی لاٹھی ٹیکتے، مستقبل سے بیگانہ، بے نشان منزلوں کے راہی، کیا ضرورت ہے بھلا اس دور میں بے کار رسموں کی۔"[7]

بینا مغربی تہذیب کو پسند کرتی ہے۔ ہوٹلوں میں کھانا کھانا اور انگلش مووی دیکھنا اس کا مشغلہ ہے۔ لباس بھی جدید پسند کرتی ہے:

"بینا: رمشہ۔۔۔ ہم کل ڈنر باہر کر رہے ہیں۔ وہیں۔۔۔ مناسب جگہ ہے۔۔ ذرا مہنگا ہوٹل ہے لیکن ٹھیک ہے۔ سنو نئی انگلش مووی آئی ہے۔ میں سٹڈی میں ہوں وہیں سے تمھیں فلم کے بارے میں بتاتی رہوں گی۔ ٹیلی فون پر رہنا سمجھی۔۔۔ (خود کلامی) یہ بھی کیا بونگی لڑکی ہے۔ نہ ڈھنگ کا لباس اور ناں۔۔۔"[8]

بینا کی والدہ بھی سلیم کے ساتھ رشتہ نہیں کرنا چاہتی۔ ان کے رہن سہن میں فرق ہے۔ دونوں گھرانوں کی سوچ میں بھی فرق حائل ہو جانے سے بینا کی والدہ جواب دے دیتی ہے تاہم جب بینا ایکسیڈنٹ ہونے سے معذور ہو جاتی ہے تو وہ سلیم سے شادی کر دیتے ہیں۔

سراب موسم

ہمارے پاکستانی نوجوان مغربی تہذیب کی چمک دمک سے اس قدر متاثر نظر آتے ہیں کہ وہ اپنا وطن تک چھوڑنے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ اس ڈرامے میں بھی نواز کاوش نے ایک ایسے لڑکے کی کہانی بیان کی ہے جو اپنا مستقبل امریکہ میں تلاش کرتا ہے۔ سپنا امریکہ میں رہائشی ہے۔ والدین کے بزنس پر چچا اور چچی قابض ہو کر ہلاک کر دیتے ہیں اور سپنا کے لیے پاکستان سے ایسا رشتہ چاہتے ہیں جو کاروبار سنبھالے اور ان کے اشاروں پر ناچے۔ خالد اپنا مستقبل امریکہ میں دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب سپنا کے چچا اور چچی رشتے کے لیے اشتہار دیتے ہیں اور گرین کارڈ کا لالچ دیتے ہیں تو خالد امریکہ چلا جاتا ہے جب کہ والد اسے روکتا ہے:

"رفیق (والد): اپنے ملک میں کیا کمی ہے۔ محنت کرو۔ یہاں بھی سب کچھ موجود ہے مگر جسے دیکھو وہ باہر جانا چاہتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی دوسروں کی غلامی کو شوق سے قبول کر لیتے ہیں۔ انھیں آزاد فضاؤں کی خوش گوار صبحوں سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ میری دعا ہے کہ خالد تمھارے یہ خواب پایہ تکمیل تک پہنچیں لیکن ہر چیز کے بارے میں اچھی طرح غور و خوض کر کے کوئی فیصلہ کرنا۔"[9]

زینت سپنا کی چچی اگرچہ امریکہ میں رہتی ہے لیکن وہاں کی تہذیب کو مشرقی تہذیب سے مختلف سمجھتے ہوئے اسے اچھا خیال نہیں کرتی۔ وہ سپنا کی شادی پاکستانی لڑکے سے کرنا چاہتی ہے:

"زینت: میری تو زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے۔ ماشاء اللہ بیٹی جوان ہے اور یہاں کی صورت حال کا پتہ ہے۔ آزاد معاشرہ، بے ہنگم لوگ، نہ ماں باپ کی قدر، نہ بڑوں کا احترام، بس اپنی مرضی ہے یہاں۔۔۔ حتیٰ کہ کسی کو سمجھانے کی کوشش کرو تو منہ کو آتا ہے۔"[10]

خالد شادی کرنے کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے اور سپنا سے شادی کر لیتا ہے۔ سپنا بھی وہاں کی تہذیب اور معاشرے سے بے زار نظر آتی ہے:

"سپنا: مغرب میں محبت اور جذبے ادھار بھی نہیں ملتے۔ کہیں کتابوں کے لفظوں میں کہیں سانس لیتے، گدگداتے اور روح میں اترتے محسوس ہوتے ہیں ورنہ اصل روح سے عاری۔۔۔ کاغذی پھولوں کی طرح حسین مگر خوشبوؤں سے بے نیاز۔۔۔"[11]

خالد کو بھی جب سپنا کے چچا اور چچی کے لالچ کا پتہ چلتا ہے تو وہ بھی وہاں رہنا نہیں چاہتا اور سپنا بھی خودکشی کر لیتی ہے:

"خالد: اس ماحول، معاشرے اور بے بسی میں کیا رہنا۔ یہ تو لالچ، حرص، طمع اور خود غرضی کا خطہ ہے۔ یہاں انسانیت نہیں حیوانیت کا راج ہے۔"[12]

اسے اپنا وطن اور اپنے وطن کی تہذیب و ثقافت پر فخر ہونے لگتا ہے اور وہ پاکستان آ جاتا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

تلی پھٹ گئی

سید امتیاز علی تاج کا ریڈیائی ڈراما 'تلی پھٹ گئی' اس دور کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جب بدیشی دور تھا۔ انگریز حکمران کے ظلم سے محکوم مر جاتا تھا تو اس کے مرنے کی وجہ تلی کا پھٹنا قرار دیا جاتا تھا۔ اس ڈرامے میں انگریز مسٹر ہنری اسٹیفنز پہلی جنگ عظیم کے موقع پر زبردستی مقامی لوگوں کو فوج میں بھرتی کرتے ہیں۔ مسیتا جو بیرے کا کام کرتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کریم کو جنگ کے محاذ پر بھیجنا نہیں چاہتا۔ مسیتا مسٹر ہنری سے سفارش کرتا ہے اور ڈاکٹر اسے نااہل قرار دیتا ہے تاہم مسٹر ہنری سٹیفنز سفارش نہ مانتے ہوئے کریم کو گولی مار کر ہلاک کر دیتا ہے۔ ہنری سٹیفنز اس کے مرنے کی وجہ تلی پھٹنا کہہ کر بچ جاتا ہے۔

مسز ہنری، مسٹر ہنری کو اس کی سخت دلی کا طعنہ دیتی ہے۔ گویا انگریزی تہذیب میں محبت کی نسبت مطلب پرستی اور احساس سے عاری جذبات عام ملتے ہیں۔ مغربی تہذیب میں یہ لطیف جذبات اکثر دم توڑتے نظر آتے ہیں۔ جب ہنری کریم کو مارتا ہے تو مسز ہنری کہتی ہے:

"مسز ہنری: تم کس طرح کسی سے محبت کی توقع کر سکتے ہو؟

مسٹر: لیکن میں اطاعت چاہتا ہوں۔

مسز: تم جسم پر حکومت کرنے کو کافی سمجھتے ہو؟

مسٹر: اور زبان پر۔

مسز: اور دل پر؟

مسٹر: میں دلوں پر حکومت کرنے کا قائل نہیں۔ دل فضول چیز ہے۔

مسز: تو میں تمھاری بیوی ہو کر تم سے دل میں نفرت کر سکتی ہوں؟

مسٹر: میں نے زبان کی آزادی نہیں دی تھی۔"[13]

گویا مغربی تہذیب جذبات کی بجائے عقل اور مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے عمل کرتی ہے جب کہ مشرقی تہذیب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جہاں ان کا سامنا ہوتا ہے وہاں آویزش ہونا لازمی امر ہے۔

شہ رگ

ابصار عبد العلی کے ڈراموں کا مجموعہ 'شہ رگ' پانچ بصری اور چار صوتی تمثیلوں پر مشتمل ہے۔ بصری ڈرامے اسٹیج اور کچھ ٹیلی ویژن پر پیش ہو چکے ہیں۔ ان ڈراموں میں متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ ماضی و حال کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ابصار عبد العلی نے اپنے عہد کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

> "ابصار عبد العلی کے یہ ڈرامے ایک رنگا رنگ دستر خوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل میں وہ ایک ذائقہ پر ہی قانع ہو کر نہیں رہ سکتے۔ مختلف ذائقوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ سو اُن کے ڈرامے کسی ایک دائرہ میں مقید ہو کر نہیں رہتے۔ مختلف دائروں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔۔۔ ہمارا عہد اپنے آشوب اور اپنے نئے نئے امکانات کے ساتھ ابصار عبد العلی کے ڈراموں میں اپنی جھلک دکھاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے قومی احساس کا پرتو بھی جابجا پڑتا دکھائی دیتا ہے۔"[14]

اس مجموعے میں ریڈیائی ڈراما 'شہ رگ' ہے۔ اس میں ابصار عبد العلی نے امیر اور غریب طبقے کے فرق کو واضح کرنے کے ساتھ مشرقی اور مغربی تہذیب کے کچھ پہلو اُجاگر کیے ہیں۔ شہلا امیر طبقے سے تعلق رکھنے والی مل کے مالک کی بیٹی ہے۔ زندگی کی ہر آسائش اس کے پاس ہے۔ گھر کی سجاوٹ مغربی طرز پر کی گئی ہے۔ ویسٹرن تہذیب اور اس کی موسیقی پسند کرتی ہے۔ دوسری طرف رحیمہ، شہلا کی ملازمہ ہے۔ غریب ہے سادہ اور مشرقی تہذیب سے محبت کرنے والی ہے۔ وہ مغربی موسیقی کو شور کہتی ہے۔ شہلا اپنے دوست شاہد کا انتظار کرتے ہوئے مغربی موسیقی کی تیز دُھن سن رہی ہے اور رحیمہ کو آواز دیتی ہے۔ وہ اس شور میں آواز نہیں سنتی۔ ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے، اس میں مشرقی اور مغربی موسیقی میں آویزش کی جھلک نظر آتی ہے۔

"شہلا: رحیمہ، رحیمہ (کوئی جواب نہیں آتا، موسیقی کی دھڑکنیں گونج رہی ہیں۔)

شہلا: (غصہ) رحیمہ! (چند لمحوں کا توقف)۔ مر گئی تھی کیا؟

Vol. 5 No.4 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

رحیمہ: (سہمی ہوئی ہے) جی کہا تو تھا۔ آ رہی ہوں۔

شہلا: پھر میں نے کیوں نہیں سنا؟

رحیمہ: شور کی وجہ سے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔

شہلا: (ہنستی ہے جیسے رحیمہ کی سادگی پر پیار آگیا ہو)۔ یہ شور ہے؟ تو بھی نرا کورا لٹھا ہے۔۔۔ ڈیم فول۔۔۔ یہ تو میوزک ہے۔۔۔ ویسٹرن!۔۔۔ ولائتی باجے کا ریکارڈ۔

رحیمہ: مجھے پتہ ہے جی۔

شہلا: (نقل اتارتی ہے)۔ مجھے پتہ ہے جی۔ تو پھر اسے شور کیوں کہتی ہو؟

رحیمہ: بندہ بہرہ ہو جاتا ہے جی۔۔۔ جب یہ ولائتی باجا بجتا ہے۔۔۔ تو دیسی بندے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔"[15]

ابصار عبد العلی نے مغربی موسیقی کا تیکھا پن جو مشرقی موسیقی سے بالکل مختلف ہے بیان کیا ہے۔ مغربی تہذیب کی چکا چوند نے دیسی انسان کو بہت متاثر کیا ہے۔ ہر خطہ کے لوگوں کے تفریحی مشاغل بھی دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ موسیقی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ بھی کسی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ سُروں کا اُتار چڑھاؤ، ان کا زیر و بم تیکھا اور تیز ہونا ہے اسے تہذیب کی پہچان بنا دیتا ہے۔ ابصار عبد العلی کا عمیق مشاہدہ ظاہر کرتا ہے کہ انھیں موسیقی کے تہذیبی تعلق کی بہت اچھی پہچان ہے۔

منٹو ڈرامے

سعادت حسن منٹو اردو ادب میں افسانہ نگار کی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ریڈیائی ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کے یہ ڈرامے کچھ قیام پاکستان سے پہلے آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوئے ہیں۔ 'منٹو ڈرامے' ان کے اس مجموعے میں 'آؤ'، 'کروٹ'، 'تین عورتیں'، 'افسانے اور ڈرامے'، 'جنازے'، 'کٹاری'، 'پھندے'، 'تلخ اور شیریں' مجموعے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ منٹو کے ڈرامے جن میں 'نیلی رگیں'، 'کبوتری'، 'ٹیڑھی لکیر'، 'جیب کترا'، 'عید کارڈ'، 'اکیلی'، 'جرنلسٹ'، 'ساڑھی'، 'تحفہ' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ڈرامے زیادہ طویل نہیں ہیں۔ زندگی سے جڑی اُلجھنیں اور نفسیاتی مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ انسانوں کی طرح ان میں بھی اپنا فلسفیانہ اور منفرد نکتۂ نظر پیش کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "ان کی تکنیک جیسا کہ آپ کو ان کے مطالعے سے معلوم ہو گا عام ریڈیائی ڈراموں سے مختلف ہے۔ مناظر کی تبدیلی میں جو دقت پیش آتی تھی میں نے چند طریقوں سے دور کرنے کی سعی کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ طریقے پیشہ ور نقادوں اور قدامت پرست، تمثیل نگاروں کو پسند نہیں آئیں گے۔ مگر اُن کی حرف گیری اس وقت تک بالکل فضول ہو گی جب تک ان دقتوں کو دور کرنے کے لیے نئے طریقے ایجاد نہ ہوں، جو ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں پیش آتی ہیں۔"[16]

آؤ اخبار پڑھیں

سعادت حسن منٹو کا یہ ڈراما، ان کے مجموعے 'آؤ' میں شامل ہے۔ اس مجموعے کا ہر ڈراما لفظ 'آؤ' سے شروع ہوتا ہے۔ ان ڈراموں میں مزاح کی چاشنی کا تڑکا لگا کر پیش کیا گیا ہے۔ 'آؤ اخبار پڑھیں' میں لاجونتی اپنے شوہر کشور کو کہتی ہے 'آؤ اخبار پڑھیں' لاجونتی زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں ہیں۔ وہ انگریزی زبان اور انگریزی اشیاء کو ناپسندیدگی سے دیکھتی ہیں۔ شوہر کشور انگریزی تہذیب کو پسند کرتے ہیں۔ انھی اختلافات کے باعث ان میں بحث شروع ہوتی ہے:

> "لاجونتی: اگر تمھاری طرح میں بھی صبح سویرے اٹھ کر یہ جو موا اخبار پڑھنا شروع کر دوں تو دیکھوں جناب کی خوشی کہاں رہتی ہے۔ خود توس سینکتے، دودھ بالتا اور چائے کا پانی بنانا پڑ جائے تو یہ اخبار اس گھر میں کبھی نظر نہ آئیں۔۔۔ دن بدن انگریز ہی بنتے جاتے ہو۔
>
> کشور: یہ انگریز بنتے چلے جانے کی بھی ایک ہی کہی۔ کھانا کھانے کے بعد سگریٹ پیے تو وہ تمھارے نزدیک انگریز، جو شیو کرنے کے بعد تھوڑا سا پاؤڈر چہرے پر مل لے وہ بھی انگریز، ہیٹ لگایا تو انگریز، ذرا بات چیت میں دو ایک شبد بھولے سے انگریزی کے بول دے، وہ بھی انگریز۔۔۔ اب ناشتے پر اخبار پڑھنے والا بھی انگریز۔۔۔ چلو بھئی انگریز ہی سہی، یہ گالی تھوڑی ہے جو چڑ جاؤں۔ وہ تم ہی ہو جو اس روز مجھ پر بگڑ گئی تھی جب میں نے تمھیں میم کہا تھا۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

لاجونتی: میم ہو کوئی تمھاری ہوتی سوتی، میں کیوں میم بنوں۔۔۔ یہ موئی لال منہ والی بندریاں تمھیں پسند تھیں تو مجھ سے بیاہ کرنے کی ضرورت کیا آن پڑی تھی۔"[17]

لاجونتی سادہ اور روایتی خاتون ہیں۔ وہ مشرقی تہذیب کی نمائندہ ہیں۔ مغربی تہذیب اور لوگوں کو ناپسند کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انگریزوں کی لائی ہوئی ہے اسے پسند نہیں کرتی نہ ہی وہ اپنے شوہر کے لیے پسند کرتی ہے۔ میاں بیوی میں انھی باتوں کا اختلاف نظر آتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کا عمیق مشاہدہ ظاہر ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ دونوں تہذیبوں میں جو فرق ہے وہ کم تو ہو سکتا ہے، مٹ نہیں سکتا۔

نووارد

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے ڈراموں کا مجموعہ 'جہان جاوید' میں شامل 'نووارد' ڈراما اس دور کا ہے جب تقسیم ہند ہوا۔ جاوید اقبال اس وقت انگریزی ادب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں ایک ڈرامائی تحریک چل پڑی تھی جسے 'اظہاریت' کا نام دیا گیا۔ جاوید اقبال بھی اس سے متاثر تھے۔ ان کے مجموعے 'جہانِ جاوید' میں زیادہ تر ڈرامے اس تحریک کے زیرِ اثر لکھے گئے۔ 'نووارد' ڈراما ایک ایسے شخص کی کیفیات کا اظہار ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کا مرنے کا وقت قریب ہے اور بستر مرگ پر ہے۔ وہ مرنے کی باتیں کرتے ہوئے اپنی بیگم، بیٹے امجد اور بیٹی کو پریشان اور دکھی کر رہا ہے۔ اسے اپنی موت کا اس قدر یقین ہے کہ وہ اپنی وصیت بھی تحریر کروالیتا ہے۔ وہ اپنے گھر کے تمام افراد کو بلا کر وصیت پڑھ کر بھی سناتا ہے اور موت کے فرشتے عزرائیل کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اپنی قبر کے لیے جگہ کا انتخاب بھی کرلیتا ہے۔ اپنے ملازم کو کفن لینے کے لیے بھی بھیج دیتا ہے۔ اسی اثنا میں 'نووارد' آتا ہے۔ وہ اپنا نام عزرائیل بتاتا ہے۔ بڑے میاں اور گھر والے اسے ملک الموت سمجھتے ہیں۔ نووارد اور گھر والوں کے ساتھ گفتگو ہوتی ہے۔ نووارد کہتا ہے کہ ہمارے لیے آج کل آسمان پر جانے کے لیے اڑن کھٹولا استعمال کرتے ہیں۔ امجد اور نووارد کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ نووارد نئی نسل کے فیشن، عشق کرنے کے انداز اور چال ڈھال کے بارے میں جانتا ہے۔ نووارد کو نئی تہذیب کا پہناوا اور اندازِ عشق بھی پسند نہیں ہے۔ وہ اس پر تنقید کرتا ہے:

"امجد: شاید یہ وہی دن تھا جب آپ نے ہم لڑکوں کو لڑکیوں کے ساتھ معاشقے کرنے سے منع کیا تھا؟

نووارد: (حقارت سے) ارے بھئی! یہ تنگ پائنچوں کی پتلونیں پہننے والے لونڈے، چلتی پھرتی غلافوں میں لپٹی سارنگیاں، بھلا کیا معاشقے کرتے ہوں گے؟ ان پر عاشق کون ہوتا ہے؟

امجد: صاحب! عاشق واشق تو سچی بات ہے کوئی نہیں ہوتا۔

نووارد: پھر؟

امجد: مگر ہم تو کسی پر عاشق ہو سکتے ہیں؟

نووارد: یہ پریشان حال، ترچھی قلمیں۔۔۔ پڑھائی میں کورے۔۔۔ اپنے باپوں کی موٹر کاروں پر چڑھنے والے اشتراکی اور اپنے سائے سے ڈرنے والے دہشت گرد۔

بیگم: واللہ۔۔۔ آپ تو اس ملک کے نوجوانوں کے بارے بہت کچھ جانتے ہیں۔

نووارد: انھیں کہئے ورزش کیا کریں۔۔۔ یہ دُبلے پتلے یرقان زدہ چہرے قوم پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔"[18]

اس ڈرامے کو ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا۔ انگریزوں کی طرزِ زندگی سے متاثر ہماری نئی نسل بھی انھی کی نقالی کرتی نظر آتی ہے۔ جاوید اقبال کے بھی اس پر گہری نظر ہے۔ بعض اوقات مغربی پہناوا اور بالوں کی تراش خراش، انداز، بزرگوں اور مشرقی تہذیب سے محبت کرنے والوں کو پسند نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ڈرامے میں طنزیہ اور مزاحیہ انداز اپناتے ہوئے جاوید صاحب نے ایک مرنے والے کے خیالات اور کیفیات کو پیش کیا ہے۔

جھوٹ اور سچ

منتخب اور مقبول ریڈیائی ڈراموں کا 'جھوٹ اور سچ' محمد عمر مہاجر کا تحریر کردہ مجموعہ ہے جسے فریسہ عقیل نے مرتب کیا ہے۔ اس میں آٹھ ڈرامے شامل ہیں۔ ان ڈراموں میں انسانی ذہن کی اُلجھنیں اور زندگی کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان ڈراموں سے فنی پختگی اور ذوق نمایاں ہے۔ یہ ڈرامے پاکستان ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔

چڑیا گھر

جس طرح چڑیا گھر میں بہت سی مخلوق دیکھنے کو ملتی ہے اور اپنی اپنی زندگی میں مگن ہوتی ہے۔ اسی طرح اس ڈرامے میں متعدد کردار ہیں۔ ہر ایک کی اپنی سوچ اور رائے ہے۔ ایک دوسرے پر تنقید کرنا اور رائے کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ عاصم کا دوست رحمان دعوت کرتا ہے۔ اس دعوت میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو امریکہ اور یورپ میں مقیم رہے ہیں۔ یورپ سے آنے والے لوگ یورپ میں رہنے کی وجہ سے فخر محسوس کرتے ہیں۔ عاصم صاحب مصنف ہیں۔ بڑی فلسفیانہ بات کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پوری محفل کی جان بنے ہوئے ہیں۔ بیگم حشمت اور ان کے خاوند حشمت ہیڈل برگ میں مقیم رہے ہیں۔ حشمت وہاں کے قصے بیان کر کے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اس ڈرامے میں تمام افراد آزاد خیال نظر آتے ہیں۔ مشرقی تہذیب سے دور۔ وہ مغربی طرز کی دعوت کرتے نظر آتے ہیں۔ تمام مرد اور خواتین آزادانہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ ڈانس کرتے ہیں۔ غیر مردوں سے گفتگو کے علاوہ ان کے ساتھ ڈانس کرنا باعث فخر سمجھتی ہیں۔ یہ تمام حالات مشرقی تہذیب سے متصادم ہیں۔ اس دعوت میں شامل تمام افراد مغربی تہذیب کے دل دادہ ہیں۔ وہ مشرقی عورت کے مشاغل سے متنافر ہیں اور مغربی طرز کی آزادانہ زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ بیگم حشمت اپنی دوست ناہید سے کہتی ہے:

> بیگم حشمت: بات یہ ہے ناہید، گھریلو ٹائپ کی عورتیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ جب دیکھو اپنے ہی قصے لے بیٹھیں گی۔ لے دے کے وہی دو موضوع ہیں، لباس کی تراش خراش، نوکروں کی شکایت، بچوں کی بیماری، گویا دنیا میں کوئی اور موضوع ہی نہیں اور اگر کبھی سیاست پولیٹکس پر بات چل نکلی تو ہیر پھیر کے گرانی پر آ کر ٹھہر جاتی ہیں۔"[19]

ان کی سوچ مغربی انداز کی خواتین جیسی ہے جو گھریلو خواتین کے مسائل نہیں سمجھتیں اور ان پر تنقید کرتی ہیں۔ خوب صورت گھروں کو پسند کرنے والی، ہر بات میں آزادانہ اظہار خیال کرنے والی یہ خواتین محفلوں میں مردوں کے ساتھ ناچنے، گانے کو باعث فخر تصور کرتی ہیں۔ اس محفل میں مغربی موسیقی چل رہی ہے۔ بیگم حشمت رقص کر رہی ہے:

> "بیگم حشمت: نہایت خوشی سے، ڈاکٹر ذرا میں یہ کافی ختم کر لوں، آؤ بیٹھ جاؤ، اتنی دور ہیں، قریب اور قریب۔
>
> ڈاکٹر: شکریہ۔
>
> بیگم حشمت: میں نے چھ رقص کیے ہیں تمھارے ساتھ اب ساتواں رقص ہو گا۔
>
> ڈاکٹر: پھر تو آپ کافی تھک چکی ہوں گی؟
>
> بیگم حشمت: (ہنستی ہے) تھکن۔۔۔
>
> ڈاکٹر: جی
>
> بیگم حشمت: یہ میری گھڑی دیکھ رہے ہو ڈاکٹر۔۔۔ اور اس کی سوئیاں۔۔۔ بیچاری سوئیاں۔۔
>
> ڈاکٹر: بے چاری!
>
> بیگم حشمت: ہاں بے۔۔۔ چاری، چلتے رہنا ان کی زندگی ہے، یہ دونوں سوئیاں پل بھر کے لیے ایک جگہ آ ملتی ہیں صرف پل بھر کے لیے، اس سے زیادہ نہیں۔۔۔ وقت رک جاتا ہے ڈاکٹر۔
>
> ڈاکٹر: خوب
>
> (رقص کی موسیقی جاری ہے)

Vol. 5 No.4 2021

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

بیگم حشمت: جی چاہتا ہے یہ رقص ختم ہی نا ہونے پائے اور میں اسی طرح تمھارے بازوؤں کے سہارے کیف و سرور کی دنیا میں اس طرح کھو جاؤں کہ پھر وہاں سے مجھے کوئی واپس نہ لا سکے۔ مگر یہ ممکن نہیں۔

ڈاکٹر: کیوں ممکن نہیں۔۔۔؟"[20]

مشرقی اور باحیا عورت کبھی بھی محفلوں میں غیر مردوں کے ساتھ رقص نہیں کرتی۔ یہ آزاد سوچ اور حیا کا پاس نہ رکھنے والی خواتین ہماری تہذیب کی نمائندہ نہیں ہو سکتیں۔ وہ یورپ کے رہن سہن سے متاثر ہونے والی ویسی ہی زندگی بسر کرنے کی خواہاں ہیں۔

ایک اور دستک (ڈرامے)

اشفاق احمد نے ٹیلی ویژن ڈراموں میں اپنا نام کمایا۔ اسی طرح ریڈیو پر بھی ان کا معتبر نام ہے۔ انھوں نے 'تلقین شاہ' کے علاوہ ریڈیائی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ ان کے یہ ڈرامے پاکستان ریڈیو سے نشر ہوتے رہے۔ 'ایک اور دستک' کے نام سے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ ان کے یہ ڈرامے مختصر گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور زندگی سے جڑی خوب صورتی کو بیان کیا ہے۔ یہ مجموعہ ۲۲ ڈراموں پر مشتمل ہے۔

شہر آرزو

انسان ہمیشہ ماضی اور مستقبل کے درمیان سفر کرتا رہتا ہے۔ حال کی اہمیت اور خوب صورتی کو فراموش کر دیتا ہے۔ ماضی کے جھروکے سے، کبھی پچھتاوؤں اور کبھی خوشیوں کو دیکھتا ہے۔ مستقبل کی خواہشات سے تعمیر کرتا رہتا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی 'ڈیڈی' اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پر سکون زندگی گزارتا ہے۔ اس کے پاس دس مرلے پر مشتمل خوش حال گھرانہ ہے۔ بچوں کے ساتھ ان کی شرارتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جانوروں سے دوستی ہے۔ جب ترقی کرتے ہوئے ایک بنگلے کا مالک بنتا ہے تو اس کو وہ سکون نہیں ملتا جو اسے چھوٹے گھر میں تھا۔ اب جب اس کے بچے جوان ہیں وہ اپنی ماں عائشہ اور والد (ڈیڈی) کی شادی کی سال گرہ منانے لگتے ہیں تو ڈیڈی ماضی کی یادوں میں کھویا دس مرلے کے گھر کا سکون یاد کر رہا ہے اور حال کو پھر فراموش کیے ہوئے ہے۔ وہ ماضی کے حسین لمحات کو یاد کرتا ہے۔ اسی میں ڈراما چلتا رہتا ہے۔ اپنے بچوں کو یاد کرتا ہے۔ ان کی مصروفیات کو دیکھتا ہے۔ ان کے مشاغل سوچ کر خوش ہوتا ہے۔ اپنی بیٹی ثمینہ سے محبت اور پیار سے پیش آتا ہے۔ اس کی دوست منیرہ سے اپنائیت سے ملتا ہے۔ ثمینہ کا کمرہ دوسری منزل پر ہے۔ اس کمرے کی کھڑکی باہر کھلتی ہے جہاں سے ایک بجلی کا کھمبا نظر آتا ہے۔ روزانہ اس کھمبے کے پاس ایک لڑکا ریاض اپنے دوست سلمان کو چھوڑنے کے لیے آتا ہے۔ ریاض اس کھڑکی سے ثمینہ کو دیکھنے کے لیے دیر تک اپنے دوست سلمان سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ خیالوں میں ثمینہ سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ اپنے دوست سلمان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کہتا ہے وہ اس کھمبے سے ہو کر رخصت نہیں ہونا چاہتا۔ سلمان ولایت جانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اسے مغربی دنیا میں اپنی ترقی اور خوب صورتی نظر آتی ہے۔ ریاض اپنے دوست سلمان سے کہتا ہے کہ تمھیں یہ ملک اور اس کے علاقے اچھے نہیں لگتے، تو وہ کہتا ہے:

"سلمان: اس شہر میں، اس محلے میں اور اس علاقے میں کیا رکھا ہے؟ جب کینیڈا میں مجھے مستقل سکونت کا پروانہ مل جائے گا پھر تم کو لکھوں گا کہ اصل زندگی کس کو کہتے ہیں اور فراغت اور دولت مندی کن گھنے جنگلوں میں بسیرا کرتی ہے۔

ریاض: تجھے یہاں کے در و بام، یہاں کے دریچے اور یہاں کی دیواریں اور منڈیریں اچھی نہیں لگتیں سلمان۔

سلمان: میں اپنی زندگی بنانا چاہتا ہوں، میں اپنا وقت، آرام اور سکون سے بسر کرنا چاہتا ہوں۔ میں فراغت اور دولت کے درمیان سائنس لینا چاہتا ہوں اور یہ ساری چیزیں ولایت میں ملتی ہیں۔۔۔

سلمان: مجھے افسوس ہے کہ میں اس جگہ کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

ریاض: جب تیری شادی ہو جائے گی اور تو یہاں اپنے بال بچوں کے درمیان۔۔۔

سلمان: میں اس ملک میں شادی نہیں کروں گا۔ اس لیے نہیں کہ اس ملک کی لڑکیاں خوب صورت نہیں بل کہ محض اس لیے کہ مجھے اپنی زندگی کو جیک لگانے کے لیے اسی ملک کی لڑکی سے شادی کرنا ہو گی جہاں میں آباد ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"[21]

ہماری نوجوان نسل کی مغربی تہذیب کی تیز روشنی سے آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ اس سے انھیں اپنے ملک کی ہر چیز دھندلی نظر آتی ہے۔ وہ یورپ کی ظاہری چمکتی تہذیب میں اپنا مقام بنانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ مشرقی تہذیب کے طور طریقے انھیں دقیانوسی لگتے ہیں۔ یہاں کی حلال اور کم آمدنی پسند نہیں ہے۔ وہ مغربی لڑکی

Vol. 5 No.4 2021
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

کو اپنی مشرقی لڑکی پر ترجیح اس لیے دیتے ہیں کہ وہ انھیں دولت مند بنا دے گی۔ معاشرے میں ان کو ایک بلند مقام حاصل ہو گا۔ یہ نسل اس بات کا خیال نہیں کرتی کہ یہ سطحی اور کھوکھلی تہذیب انسان کو کامیابی نہیں بل کہ تنزلی کا شکار کر دیتی ہے۔ ظاہری طور پر اس میں کشش ضرور ہے لیکن یہ انسان کی روحانیت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ رشتوں سے دور کر دیتی ہے۔ خود غرضی کا مادہ انسان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامے میں ریاض اور سلمان کے درمیان یہی اختلاف نظر آتا ہے۔ ریاض سلمان کو اپنی تہذیب کی اہمیت بتاتا ہے لیکن سلمان کو مغرب کی چمک متاثر کرتی ہے۔

کچھ تم بولو کچھ ہم بولیں

ریڈیائی تمثیلوں پر مشتمل 'کچھ تم بولو کچھ ہم بولیں' ۲۱ تمثیلوں پر مشتمل ہے۔ یہ تمثیلیں انتہائی مختصر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے موضوعات پر پروفیسر محمد سلیم ملک نے زندگی کے تجربات بیان کیے ہیں۔ پروفیسر محمد سلیم ملک اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "یہ تمثیلیں اپنی طوالت میں چھوٹی چھوٹی سی ہیں، جن کا دورانیہ پانچ دس منٹ سے زائد کا رہا ہو گا۔ ان میں کسی خوش گوار واقعے کو پھیلا کر تمثیل کی شکل دی گئی ہے جس میں حیرت کی فضا برابر قائم رہتی ہے۔ دو تین کردار ہنستے مسکراتے ہیں۔ سادہ اور سلیس زبان میں گفت گو کرتے اور بات سے بات نکلتی ہے، یہاں تک کہ تمثیل کسی نوکیلے جملے پر جا رکتی ہے۔ قاری تبسم میں بھیگ جاتے ہیں اور بیسویں صدی کا بہاول پور ہماری آنکھوں کے آگے آ جاتا ہے۔"[22]

یہ مختصر ریڈیائی تمثیلیں دل چسپی کا عنصر لیے سامعین کو مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ان میں کہیں کہیں اپنی تہذیب اور مغربی تہذیب کی خوبیاں اور خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان میں 'ریڈیو کی قیمت' عنوان کے تحت ایک تمثیل میں مغربی ممالک میں جانے کے لیے کوشش اور وہاں کی تہذیب کی محبت ظاہر کی گئی ہے۔ امریکہ جانے کا خواب ہر شخص دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ملک کی ہر چیز چھوڑ کر امریکہ آباد ہونے کی بات کرتا ہے۔ اپنے ملک میں اپنا کاروبار بند کر کے باہر کی دنیا میں آباد ہونے کو پسند کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں کمال اپنے علاقے میں کاروبار کر رہا ہے۔ اسے امریکہ جانے کا شوق ہے جس کے باعث وہ اپنا تمام کاروبار ختم کر کے امریکہ کا ویزا لینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے دوست عابد سے کہتا ہے کہ وہ تمام چیزیں خرید لے:

> "کمال: تم نہیں خریدو گے تو کوئی اور لے جائے گا۔ آخر بیچنی تو ہیں مجھے۔
>
> عابد: وہ تو ٹھیک ہے، مگر۔۔۔
>
> کمال: دیکھو عابد! تم جانتے ہو مجھے امریکہ جانا ہے، پتہ نہیں کب واپسی ہو۔ پڑے پڑے بے کار ہو جائیں گی میری چیزیں۔
>
> عابد: بات تو ٹھیک ہے تمھاری۔
>
> کمال: تم خریدو گے تو مجھے خوشی ہو گی کہ دوست نے لی ہیں۔۔۔
>
> عابد: کیا باہر جانے کا کرایہ ان سے بناؤ گے؟
>
> کمال: اور نہیں تو کیا؟"[23]

کمال کو امریکہ جانے کے لیے اپنے چلتے ہوئے کاروبار کو بھی بند کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کا دوست اس پر طنز کرتا ہے لیکن کمال پر جو مغربی معاشرت اور وہاں کی چمک دمک کا اثر ہو چکا ہے وہ جانے سے باز نہیں آتا۔

ہمارے معاشرے کا بھی یہی المیہ ہے کہ ذہنی طور پر یہ غلامی کی زنجیر سے ابھی بھی آزادی حاصل نہیں کر پائے اور اس کی کشش اسے اسی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں۔

حوالہ جات

[1] رشید امجد (مرتب)، پاکستانی ادب (ڈراما)، چھٹی جلد، راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۸۸ء، ص ۸۶۔۸۷

[2] ایضاً، ص ۸۸

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

[3] ابراہیم یوسف، اردو کے اہم ڈراما نگار، فتح گڑھ: بھوپال مالوہ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴، ص ۶

[4] نواز کاوش، ڈاکٹر، سبق پھر پڑھ، مشمولہ سراب موسم، (ریڈیائی ڈرامے)، بہاول پور: چولستان علمی وادبی فورم، مارچ ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۲

[5] ایضاً، ص ۱۱۱

[6] ایضاً، ص ۱۱۷

[7] نواز کاوش، ڈاکٹر، ایک نیا موڑ، (ڈراما)، مشمولہ سراب موسم (ریڈیائی ڈرامے)، ص ۱۲۲

[8] ایضاً، ص ۱۲۳

[9] نواز کاوش، ڈاکٹر، سراب موسم، (ڈراما)، مشمولہ سراب موسم (ریڈیائی ڈرامے)، ص ۲۱۰

[10] ایضاً، ص ۲۱۵۔۲۱۶

[11] ایضاً، ص ۲۱۸

[12] ایضاً، ص ۲۲۵

[13] تاج، امتیاز علی، سید، تلی پھٹ گئی، (ڈراما)، مشمولہ سید امتیاز علی تاج کے یک بابی ڈرامے، مرتبہ، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، لاہور: ادارہ تالیف وترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، جون ۲۰۰۶ء، ص ۹۳

[14] انتظار حسین، دیباچہ، مشمولہ شہ رگ از مصنف ابصار عبدالعلی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۵

[15] ابصار عبدالعلی، شہ رگ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۷

[16] سعادت حسن منٹو، منٹو ڈرامے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱

[17] سعادت حسن منٹو، آؤ اخبار پڑھیں، مشمولہ، منٹو ڈرامے، ص ۳۳۸، ۳۳۷

[18] جاوید اقبال، ڈاکٹر، نووارد، مشمولہ جہان جاوید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۳۵

[19] محمد عمر مہاجر، چڑیا گھر، مشمولہ، جھوٹ اور سچ، (منتخب اور مقبول ریڈیائی ڈرامے)، مرتبہ فریسہ عقیل، کراچی: بزم تخلیق ادب پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۷۸

[20] ایضاً، ص ۸۹۔۹۰

[21] اشفاق احمد، شہر آرزو، مشمولہ، ایک اور دستک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۴۸

[22] محمد سلیم اختر، پروفیسر، ڈاکٹر، (دیباچہ)، کچھ تم بولو کچھ ہم بولیں، لاہور: بک ہوم، ۲۰۱۷ء، ص ۷

[23] ایضاً، ص ۵۰